ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3919

Program: BS Islamic Studies (Spec. Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: عہدِ نبوی میں اسلامی ریاست کا نظم ونسق (3919) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ 5 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: قانونِ مساوات کے نفاذ میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ قانونِ مساوات کے نفاذ میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت واضح کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

مساوات انسانی معاشرے کے عدل و امن کی بنیاد ہے۔ قانونِ مساوات سے مراد یہ اصول ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہوں، قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہو اور کسی شخص کو اس کے خاندان، دولت، عہدے، نسل یا مذہب کی بنیاد پر قانون سے بالاتر یا قانون کے تحفظ سے محروم نہ سمجھا جائے۔ جدید دنیا میں اس اصول کو انسانی حقوق کے منشورات اور آئینوں میں بنیادی درجہ حاصل ہے، لیکن عملی تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں یہ اصول صرف کاغذ پر رہا اور معاشرے کی اخلاقی و مذہبی تربیت اس کے ساتھ نہ جُڑی، وہاں قانون طاقتور کے ہاتھ میں موم کی ناک بن گیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی تعلیمات کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے، کیونکہ اسلام نے مساوات کو محض قانونی شق نہیں بنایا بلکہ اسے عقیدے، اخلاق اور حکمران کے ضمیر کی نگرانی سے جوڑ دیا۔ مدنی ریاست میں اس کی عملی صورتیں قانون کے سامنے رشتہ دار و اجنبی کی برابری، عدالت میں امیر و غریب کا یکساں مقام اور خطبۂ حجۃ الوداع میں بیان کردہ انسانی مساوات کے اعلان کی صورت میں سامنے آئیں۔ اس جواب میں پہلے اسلامی مساوات کی نظری بنیاد بیان کی جائے گی، پھر یہ واضح کیا جائے گا کہ اسلامی تعلیمات قانونِ مساوات کے نفاذ کو کن کن پہلوؤں سے آسان و مؤثر بناتی ہیں، اور آخر میں اس کے چیلنجز اور عصری اہمیت کا جائزہ پیش ہو گا۔ یہ بحث عمومی اصولوں تک محدود ہے؛ کسی خاص مقدمے پر فیصلہ عدالتوں کا کام ہے۔

اسلامی مساوات کی نظری بنیاد

اسلام میں مساوات کی بنیاد انسانی وحدت کا عقیدہ ہے۔ قرآن کریم کے مفہوم کے مطابق تمام انسان ایک ہی اصل سے پیدا کیے گئے ہیں اور قبائل و قوموں کی تقسیم صرف پہچان کے لیے ہے، فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے (سورۃ الحجرات 49:13 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اسی طرح خطبۂ حجۃ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی آخری بڑی مجلس میں اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر ذات کی بنیاد پر کوئی فضیلت نہیں (مسند احمد سمیت سیرت و حدیث ماخذ میں معروف خطبے کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اس بنیاد سے مساوات کے تین ستون نکلتے ہیں۔ پہلا ستون یہ ہے کہ قانون کا منبع حکمران کی خواہش نہیں بلکہ وہ الٰہی ہدایت و آئین ہے جس کے سامنے خود حکمران بھی جواب دہ ہے، لہٰذا قانون سب سے بالا ہو جاتا ہے۔ دوسرا ستون یہ ہے کہ انسان کی عزت و حرمت اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے، جس کا تحفظ امیر و غریب دونوں

کے لیے ایک جیسا ہے۔ تیسرا ستون اخروی احتساب کا شعور ہے: جس شخص کو یقین ہو کہ قانون سے بچ بھی گیا تو آخرت میں حساب سے نہیں بچ سکتا، اس کے لیے مساوات کا نفاذ بیرونی دباؤ کے بجائے اندرونی ایمان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ یہی تین ستون قانونِ مساوات کو دوسرے نظاموں کے مقابلے میں اسلامی معاشرے میں زیادہ گہری عملی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

تعلیمات کی اہمیت (1): قانون کی بالادستی اور دوہرے معیار کا خاتمہ

قانونِ مساوات کے نفاذ کی پہلی رکاوٹ طاقتور طبقے کا استثنا ہوتا ہے: امیر کے لیے نرم قانون اور غریب کے لیے سخت۔ اسلامی تعلیم اس رکاوٹ کو جڑ سے کاٹتی ہے۔ معروف تاریخی واقعہ ہے کہ ایک معزز خاندان کی عورت چوری کے مقدمے میں پکڑی گئی تو بعض صحابہ نے سفارش کی کوشش کی، جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور اعلان کیا کہ پہلی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ کمزور پر قانون لگاتے اور طاقتور کو چھوڑ دیتے تھے، اور اللہ کی قسم اگر اس جگہ میری اپنی بیٹی بھی ہوتی تو اس پر بھی قانون جاری ہوتا (صحیح بخاری و مسلم میں مذکور واقعے کے مفہوم کا خلاصہ، حوالہ بطور مفہوم دیا گیا ہے)۔ یہ تعلیم قانون نافذ کرنے والوں کے دلوں میں وہ ہیبت پیدا کرتی ہے جو کسی نگرانی کے نظام سے پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ ہیبت اللہ کی نگرانی کے عقیدے سے جُڑی ہے۔ اسی اصول کی عملی صورت خلافتِ راشدہ میں بھی دکھائی دی، جہاں خلیفہ خود عدالت میں پیش ہونے کو اپنی توہین نہیں سمجھتا تھا اور عام شہری حاکم سے حق کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ اسلامی تاریخ نگار اسی رویے کو عدلِ فاروقی جیسی مثالوں میں بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات کا پہلا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ قانون کی بالادستی کو نعرے کے بجائے حکمران و افسر کے ضمیر کی پکار بنا دیتی ہیں، اور جب اوپر سے مثال قائم ہو تو نیچے تک نفاذ آسان ہو جاتا ہے۔

تعلیمات کی اہمیت (2): عدل کی فرضیت اور عدالتی غیر جانبداری

دوسری اہمیت یہ ہے کہ اسلام عدل کو اختیاری اچھائی نہیں بلکہ فرض اور ایمان کا تقاضا قرار دیتا ہے۔ قرآن کریم نے انصاف پر قائم رہنے اور دشمنی کو بھی عدل سے انحراف کا سبب نہ بننے دینے کی ہدایت دی ہے (سورۃ المائدہ 5:8 کے مفہوم کا خلاصہ)، اور فیصلہ کرتے وقت امانت و انصاف کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے (سورۃ النساء 4:58 کے مفہوم کا

خلاصہ)۔ ان ہدایات کی روشنی میں جج و اہل کار کے لیے غیر جانبداری محض پیشہ ورانہ قاعدہ نہیں بلکہ دینی فریضہ بن جاتا ہے، جس کی خلاف ورزی دنیا میں بدلہ دہی کے ساتھ ساتھ گناہ بھی ٹھہرتی ہے۔ اسی تناظر میں اسلامی فقہ و قضا کی روایت نے شہادت، ثبوت اور سماعت کے ایسے ضوابط بنائے کہ قانون کمزور کی ڈھال بنے: دونوں فریقوں کو سنا جائے، ثبوت پیش کرنے والے پر ہو، اور شبہ کی صورت میں حد و سزا میں احتیاط برتی جائے، جس کا معروف اصولی مفہوم یہ ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے۔ یہ تفصیلات اسلامی تعلیمات ہی کی پیدا کردہ ہیں اور قانونِ مساوات کو عملی صورت دیتی ہیں، کیونکہ مساوات کا اصل امتحان عدالت میں ہوتا ہے کہ وہاں غریب کا مقدمہ امیر کے خلاف اتنی ہی توجہ سے سنا جائے جتنی توجہ امیر کے مقدمے کو ملتی ہے۔ اسی لیے اسلامی تہذیب میں قاضی کا ادارہ شروع ہی سے انتظامیہ سے الگ، محترم اور غیر جانبدار رکھا گیا۔

تعلیمات کی اہمیت (3): سماجی مساوات اور کمزور طبقات کا تحفظ

قانون کی مساوات اس وقت تک ادھوری رہتی ہے جب تک سماجی سطح پر تعصب باقی رہے۔ اسلامی تعلیمات سماجی مساوات کی فضا بھی تیار کرتی ہیں: نماز کی صف میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں، حج میں سب ایک جیسا لباس پہنتے ہیں، روزہ سب پر یکساں فرض ہوتا ہے اور مسجد کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ عبادتوں کا یہ معمول سماج کے دل میں روزانہ یہ درس دہراتا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقام دولت و نسل سے نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے ان طبقات کو قانونی و معاشی تحفظ بھی دیا جو عام طور پر مساوات سے محروم رہتے ہیں: یتیم کے مال کی حفاظت کی سخت تاکید کی گئی، غلاموں کی آزادی کو نیکی و کفارے کا ذریعہ بنایا گیا، عورتوں کو وراثت و مہر کے حقوق دیے گئے اور غیر مسلم شہریوں کی جان و مال و عبادت گاہوں کو ریاستی تحفظ ملا، جس کی بنیاد میثاقِ مدینہ سے پڑی تھی۔ یوں اسلامی تعلیمات قانونِ مساوات کو ایک جامع سماجی ماحول فراہم کرتی ہیں جس میں کتاب کا قانون بھی موجود ہے اور دل کا قانون بھی۔ البتہ یہ واضح رہے کہ کسی خاص تنازع میں حقوق کا تعین و نفاذ عدالتوں اور مجاز اداروں کا کام ہے؛ یہاں اصول کی علمی وضاحت مقصود ہے۔

جدول: قانونِ مساوات کے نفاذ میں اسلامی تعلیمات کا کردار

پہلو	اسلامی تعلیم	نفاذ پر اثر

دوہرا معیار ختم، حکمران بھی پابند	طاقتور کے لیے استثنا کا خاتمہ	قانون کی بالادستی
عدلیہ کی غیر جانبداری مضبوط	انصاف ایمان کا تقاضا	عدل کی فرضیت
تعصب میں کمی، عوامی قبولیت	عبادات میں عملی برابری	سماجی مساوات
قانون کمزور کی ڈھال	یتیم، مسکین، غیر مسلم شہری کے حقوق	کمزور کا تحفظ
نگرانی کے بغیر بھی نفاذ کی قوت	آخرت میں جواب دہی کا عقیدہ	اخروی احتساب

ثمرات اور عصری اہمیت

جب قانونِ مساوات مذہبی تعلیمات کے سہارے نافذ ہوتا ہے تو اس کے ثمرات واضح ہوتے ہیں۔ پہلا ثمرہ عوام کا قانون پر اعتماد ہے جس سے لوگ اپنے تنازعات سڑک و سفارش کے بجائے عدالت سے حل کرانے لگتے ہیں۔ دوسرا ثمرہ سماجی امن ہے، کیونکہ محرومی و پست ہمتی کا احساس ہی بغاوت و جرم کی جڑ ہوتا ہے اور مساوات اس احساس کو مٹاتی ہے۔ تیسرا ثمرہ اچھے حکمران و اہل کار کی تیاری ہے، جب عہدیدار عدل کو عبادت سمجھے تو اس کی کارکردگی نگرانی کے بغیر بھی درست رہتی ہے۔ چوتھا ثمرہ اقلیتوں و کمزوروں کے دل میں ریاست سے وفاداری ہے، جو کسی بھی کثیر النسلی و کثیر المذاہب ریاست کے استحکام کے لیے ناگزیر ہے۔ عصرِ حاضر میں پاکستان سمیت بہت سی مسلمان ریاستوں کے آئینوں میں مساوات کی شقیں موجود ہیں مگر نفاذ میں کمی کی شکایت عام ہے۔ اس کا علاج اسلامی تناظر میں یہی ہے کہ قانون کے ساتھ تربیت بھی ہو: اہل کاروں کی اخلاقی و پیشہ ورانہ تربیت، تعلیمی نصاب میں عدل و حقوق کی تعلیم، عدالتوں کو تیز و سستا انصاف مہیا کرنے کے وسائل، اور سماجی سطح پر تعصب کی حوصلہ شکنی۔ یہ تمام اقدامات انہی دینی اصولوں کی جدید تطبیق ہیں اور بتاتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات قانونِ مساوات کے لیے محض تاریخی فخر نہیں بلکہ عملی رہنما اصول ہیں۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات قانونِ مساوات کے نفاذ میں تین بنیادی کردار ادا کرتی ہیں: وہ مساوات کو الٰہی حکم و عقیدے کی بنیاد دے کر اسے نفاذ کرنے والوں کے ضمیر سے جوڑ دیتی ہیں، وہ حکمران و قاضی سمیت سب کو قانون کے تابع کر کے دوہرے معیار کا خاتمہ کرتی ہیں، اور وہ عبادات و سماجی احکام کے ذریعے وہ فضا تیار کرتی ہیں جس میں مساوات کا قانون عوام کو قدرتی و مقبول لگتا ہے۔ مدنی ریاست کی عملی تاریخ ان اصولوں کی گواہ ہے۔ آج کا چیلنج انہی اصولوں کو جدید اداروں میں پوری ایمان داری سے نافذ کرنا ہے، کیونکہ مساوات کے بغیر عدل اور عدل کے بغیر کوئی ریاست فلاحی و پرامن نہیں رہ سکتی۔

سوال نمبر 2: مدنی ریاست کے معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ مدنی ریاست کے معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات بیان کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

مدنی ریاست کا معاشی نظام اس لیے تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ چند سالوں میں ایک چھوٹے سے، جنگوں میں گھرے شہر کو ایسا منظم معاشی مرکز بنا گیا جس میں نظامِ مالیات، بازار کی نگرانی، فلاحی تقسیم اور زرعی و تجارتی ترقی سب یکجا نظر آتے ہیں۔ ہجرت کے وقت مدینہ کی معاشی حالت سادہ تھی: مہاجرین اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ آئے تھے، انصار زراعت پیشہ تھے، یہودی قبائل بازار و قرض کے کاروبار میں ممتاز تھے اور کھجور اصل پیداوار تھی۔ ایسی بنیادوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر خلفائے راشدین نے جو نظام تشکیل دیا اس کی بنیاد قرآنی تعلیمات پر تھی: مالکیت کی حقیقت، زکاۃ و صدقات کا نظام، سود و ذخیرہ اندوزی کی ممانعت، کسبِ حلال کی عزت اور دولت کی گردش کا اصول۔ اس نظام کو نہ مکمل سرمایہ دارانہ کہا جا سکتا ہے اور نہ اشتراکی، کیونکہ اس میں نجی ملکیت کا احترام بھی ہے اور سماجی ذمہ داری کی مضبوط قید بھی۔ اس جواب میں مدنی معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات کو الگ الگ عناوین کے تحت بیان کیا جائے گا، جن میں ملکیت کا تصور، زکاۃ و بیت المال، بازار و تجارت کے اصول، سود و حرام ذرائع کی ممانعت، زراعت و مواخات اور دولت کی منصفانہ گردش شامل ہیں، اور آخر میں اس نظام کے اثرات کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

خصوصیت 1 تا 2: ملکیت کا متوازن تصور اور کسبِ حلال کی عزت

مدنی معاشی نظام کی پہلی خصوصیت ملکیت کا متوازن تصور ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان مال کا امین و نائب ہے (سورۃ الحدید 57:7 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اس تصور کے دو عملی نتیجے نکلے: ایک طرف نجی ملکیت کا پورا احترام کیا گیا، کسی کی جائز کمائی و جائیداد کو بلاوجہ چھیننا حرام قرار پایا اور تجارت و وراثت کے تفصیلی احکام دیے گئے، اور دوسری طرف ملکیت کو مطلق العنان نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس میں مسکین و محتاج کا حق مقرر کر دیا گیا (سورۃ الذاریات 51:19 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ دوسری خصوصیت کسبِ حلال کی عزت و ترغیب ہے۔ مدنی تعلیمات میں محنت و مزدوری کو عبادت کے درجے میں رکھا گیا، ہاتھ سے کمانے والے کو سراہا گیا، اور خود حکمران و صحابہ نے بازار میں تجارت، کھیتوں میں کاشت اور دست کاری سے روزی کما کر مثال قائم کی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے بعد بازار کی طرف رہنمائی ہی مانگی تھی اور اپنی محنت و دیانت سے دوبارہ خوش حال تاجر بن گئے، جو اس نظام کی روح کی بہترین مثال ہے کہ ریاست سہارا ضرور دیتی ہے مگر اصل راستہ محنت کا رکھا جاتا ہے۔ اس خصوصیت نے مدنی معاشرے میں کاہلی و بھیک کے بجائے کاروباری ذہنیت پیدا کی، جو معاشی ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔

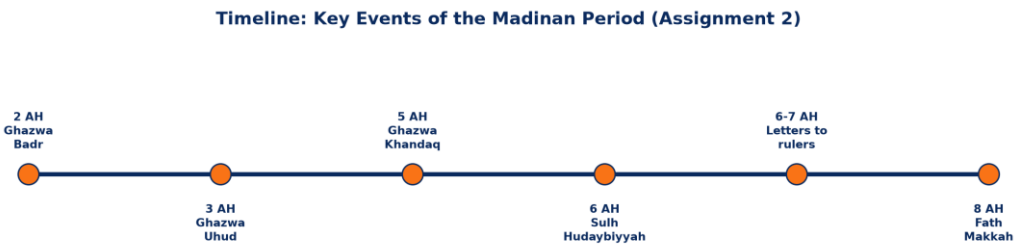
خصوصیت 3 تا 4: زکاۃ و بیت المال کا نظام اور سود و استحصال کی ممانعت

تیسری اور سب سے مرکزی خصوصیت زکاۃ کا ادارہ جاتی نظام ہے۔ زکاۃ کو محض انفرادی خیرات نہیں رکھا گیا بلکہ ریاست باقاعدہ عاملین کے ذریعے اس کی وصولی کرتی، بیت المال میں جمع کرتی اور قرآن کے بیان کردہ مصارف یعنی فقرا، مساکین، عاملین، قرض داروں، مسافروں وغیرہ پر خرچ کرتی تھی (سورۃ التوبہ 9:60 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ اس نظام سے ریاست کو مستقل فلاحی آمدنی ملی، غریبوں کو باعزت سہارا ملا اور دولت کی گردش کا ایک خودکار ذریعہ قائم ہو گیا۔ زکاۃ کے ساتھ صدقات، فدیے، خمسِ غنیمت، خراج و جزیہ وغیرہ بھی بیت المال کی آمدنی کے ذرائع تھے جنھیں قواعد کے تحت وصول و صرف کیا جاتا تھا۔ چوتھی خصوصیت سود، ذخیرہ اندوزی اور دھوکے جیسے استحصالی ذرائع کی ممانعت ہے۔ قرآن کریم نے سود کو سخت الفاظ میں ممنوع قرار دیا اور تجارت کو جائز رکھا (سورۃ البقرہ 2:275 کے مفہوم کا خلاصہ)، اسی طرح بازار کی نگرانی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذخیرہ کر کے مہنگا بیچنے اور تر و خشک سامان ملا کر دھوکا دینے جیسی صورتیں رد فرمائیں (کتبِ حدیث میں معروف بازار کے واقعات کے مفہوم کا خلاصہ)۔

اس ممانعت کی معاشی حکمت یہ تھی کہ سرمایہ محنت و خطرے کے بغیر بڑھنے نہ پائے اور قیمتیں مصنوعی قلت سے بے قابو نہ ہوں۔ یوں مدنی نظام نے منافع کو جائز مگر اخلاقی و قانونی حدود کا پابند رکھا۔ جزئی فقہی فیصلے علماء وعدالتوں کے دائرے میں ہیں؛ یہاں صرف نظام کی خصوصیات کی وضاحت مقصود ہے۔

خصوصیت 5 تا 6: آزاد مگر منظم بازار اور زراعت و آب پاشی کی ترقی

پانچویں خصوصیت آزاد مگر منظم بازار ہے۔ مدینہ میں مسلمانوں کا الگ بازار قائم کیا گیا جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمتوں کو جبراً مقرر نہ کرنے کے اصول کو برقرار رکھا، کیونکہ طلب و رسد کی قدرتی حرکات کو روکنا خود ظلم بن سکتا ہے؛ تاہم بازار مکمل بے لگام نہیں تھا، کیونکہ محتسب کے طرز پر نگرانی، ناپ تول کی درستگی، وزن و پیمانے میں کمی کی مذمت (سورۃ المطففین کے مفہوم کا خلاصہ) اور معاہدوں کی پاس داری نظام کا حصہ تھی۔ ان اصولوں نے تجارت کو وہ آزادی بھی دی جو ترقی کے لیے ضروری ہے اور وہ ضبط بھی جو عوام کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔ چھٹی خصوصیت زراعت کی حوصلہ افزائی اور بنجر زمین کی آبادکاری ہے۔ معروف دینی اصول کے مفہوم کے مطابق جو شخص مردہ یعنی بنجر زمین کو آباد کرے اس کی محنت کو حق و ترغیب دی گئی، درخت لگانے کو صدقہ قرار دیا گیا اور کاشت کاروں کو زمین کی پیداوار و تقسیم کے منصفانہ طریقے، مثلاً مزارعت کے قواعد، سکھائے گئے۔ کھجور کے باغات، وادیِ عقیق جیسے علاقوں کی آبیاری اور کنوؤں کی کھدائی وقف اسی رجحان کے ثمرات تھے۔ اس خصوصیت نے خوراک کی خود کفالت بڑھائی اور زرعی آمدنی کے ذریعے دیہات کو ریاست کی معیشت سے جوڑ دیا، جو کسی بھی نوزائیدہ ریاست کے لیے زندگی و موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔



شکل: مدنی دور کے نمایاں واقعات کی زمانی ترتیب — معاشی نظام انہی مراحل کے ساتھ بتدریج منظم ہوا۔

خصوصیت 7 تا 8: مواخات و سماجی تحفظ اور دولت کی گردش

ساتویں خصوصیت مواخات اور سماجی تحفظ کا نظام ہے۔ ہجرت کے فوراً بعد مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے نے تاریخ کی انوکھی مثال قائم کی جس میں انصار نے اپنے مال، مکان و کاروبار میں مہاجر بھائیوں کو شریک کیا۔ یہ وقتی امداد نہیں تھی بلکہ معاشی نظام کی ایک اخلاقی بنیاد تھی جس نے بے سہارا آبادی کو چند ماہ میں ریاست کی پیداواری قوت بنا دیا۔ اسی تسلسل میں بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کے لیے دعائف مسافروں کے لیے مہمان داری، غلاموں کی آزادی کی ترغیب اور قرض داروں کی مدد جیسے سماجی تحفظ کے عملی پہلو اس نظام میں شامل رہے۔ آٹھویں خصوصیت دولت کی گردش کا اصول ہے: ریاست کا ہدف یہ تھا کہ مال صرف اوپر کے طبقے میں نہ گھومے بلکہ نیچے تک پہنچے (سورۃ الحشر 59:7 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ زکاۃ، صدقات، وراثت کی تقسیم (جو جائیداد کو ایک ہاتھ میں مرتکز ہونے سے روکتی ہے) اور وقف کے ادارے مل کر اس گردش کو یقینی بناتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں وظائف کے رجسٹرز اور بیت المال کی توسیع اسی خصوصیت کی عملی صورت تھی۔ ان آٹھ خصوصیات کا مجموعی اثر یہ نکلا کہ مدنی معیشت میں نہ سرمایہ دار کا راج ہوا اور نہ ریاست نے نجی محنت کا گلا گھونٹا، بلکہ ایک متوازن نظام قائم ہوا جس میں فرد کمائے، ریاست انصاف کی نگرانی کرتی ہے اور معاشرہ کمزور کا سہارا بنتا ہے۔

جدول: مدنی معاشی نظام کی خصوصیات کا خلاصہ

عملی ادارہ / صورت	بنیادی اصول	خصوصیت
نجی ملکیت + محتاج کا حق	انسان مال کا امین ہے	متوازن ملکیت
عاملین، بیت المال، وظائف	منظم وصولی و مصارف	زکاۃ و بیت المال
قرضِ حسنہ و شراکت کی ترغیب	استحصال سے پاک لین دین	سود کی ممانعت
بازارِ مدینہ، ناپ تول کی درستگی	طلب و رسد + اخلاقی نگرانی	منظم آزاد بازار

مزارعت، باغات، وقفِ کنویں	بنجر زمین کی آبادکاری	زرعی ترقی
زکاۃ، وراثت، صدقات، اوقاف	مال چند ہاتھوں میں نہ سمٹے	دولت کی گردش

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مدنی ریاست کے معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات آٹھ ہیں: اللہ کی اصل مالکیت کے تحت متوازن نجی ملکیت، کسبِ حلال و محنت کی عزت، زکاۃ و بیت المال کا ادارہ جاتی فلاحی نظام، سود و ذخیرہ اندوزی و دھوکے کی ممانعت، آزاد مگر نگرانی یافتہ بازار، زراعت و آبادکاری کی حوصلہ افزائی، مواخات و سماجی تحفظ، اور دولت کی مسلسل گردش۔ ان خصوصیات نے مدینہ کو چند برسوں میں معاشی خود کفالت، سماجی توازن اور انتظامی استحکام عطا کیا۔ آج کی مسلمان معیشتوں کے لیے یہ نظام اس لحاظ سے رہنما ہے کہ وہ اخلاق، فلاح اور ترقی کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کے بجائے ایک ہی نظام میں جوڑتا ہے، اور بتاتا ہے کہ معیشت کی کامیابی کا معیار محض پیداوار نہیں بلکہ اس پیداوار کا انصاف کے ساتھ سب تک پہنچنا ہے۔

سوال نمبر 3: صلح حدیبیہ کے فوری اور طویل المدتی نتائج (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ صلح حدیبیہ کے فوری اور طویل المدتی نتائج بیان کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

صلح حدیبیہ سن 6 ہجری کا وہ عظیم واقعہ ہے جسے قرآن کریم نے فتحِ مبین قرار دیا (سورۃ الفتح 48:1 کے مفہوم کا خلاصہ)، حالانکہ بظاہر اس میں لڑائی ہوئی نہ کوئی فوری سیاسی کامیابی نظر آئی۔ واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرے کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، قریش نے حدیبیہ کے مقام پر روکا، طویل مذاکرات ہوئے اور بالآخر سہیل بن عمرو کی شرائط پر ایک تحریری معاہدہ ہوا جس کی نمایاں شقیں یہ تھیں: دس سال تک جنگ بندی، مسلمان اس سال عمرہ

کیے بغیر لوٹیں گے اور اگلے سال عمرہ کر سکیں گے، قبائل کو آزادی ہو گی کہ وہ جس فریق سے چاہیں معاہدہ کریں، اور مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ آنے والے کو واپس کیا جائے گا جبکہ مدینہ سے مکہ جانے والے کو واپس نہیں کیا جائے گا (عام سیرت ماخذ کے معروف نکات کے مفہوم کا خلاصہ)۔ بظاہر یہ شرائط سخت لگیں اور بعض صحابہ کو وقتی طور پر دل گرفتگی ہوئی، مگر چند برسوں کے نتائج نے ثابت کیا کہ یہ معاہدہ ریاستِ مدینہ کی سیاست کا شاہکار تھا۔ اس جواب میں پہلے نتائج کو فوری اور طویل المدتی دو خانوں میں تقسیم کر کے بیان کیا جائے گا، پھر یہ واضح کیا جائے گا کہ وقتی دباؤ قبول کرنے کے درس کامیابی کیسے حاصل کی گئی اور اس سے آج کی سفارت کاری کے لیے کیا اصول نکلتے ہیں۔

پس منظر اور معاہدے کی نوعیت

نتائج کو سمجھنے سے پہلے معاہدے کی نوعیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ حدیبیہ میں مسلمانوں کی نیت جنگ نہیں عمرہ تھی؛ وہ احرام میں تھے، قربانی کے جانور ساتھ تھے اور ہتھیار سفر کے محدود تھے۔ قریش کی کوشش تھی کہ مسلمان مکہ میں داخل نہ ہوں، کیونکہ اس سے عرب میں ان کی ساکھ متاثر ہوتی۔ مسلمانوں کی کوشش یہ تھی کہ خونریزی کے بغیر مکہ کے مقدس شہر سے ان کا دینی و سیاسی تعلق قائم رہے اور دنیا پر واضح ہو جائے کہ مدینہ کی ریاست پرامن ارادے رکھتی ہے۔ دونوں فریقوں کی یہی مقاصد پس پردہ مذاکرات کی بنیاد بنے۔ معاہدہ تحریری ہوا، گواہ بنے اور دفعات محدود و واضح رکھی گئیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی وقتی جذبات نہیں بلکہ باقاعدہ بین الاقوامی طرز کا سیاسی سند تھی۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارت اور بیعتِ رضوان جیسے مراحل نے مسلمانوں کے اتحاد و قیادت پر مکمل اعتماد کا مظاہرہ کیا، جس کے دباؤ سے ہی قریش آخر کار مذاکرات کی میز پر آئے۔ لہٰذا نتائج کا جائزہ لیتے وقت یہ یاد رہے کہ صلح کسی کمزوری سے نہیں بلکہ طاقت کے ہوتے ہوئے حکمت کے ساتھ قبول کی گئی تھی، اور یہی فرق اس کے فوری و طویل المدتی اثرات کو سمجھنے کی کلید ہے۔

فوری نتائج (1): جنگ بندی اور انسانی جانوں کا تحفظ

صلح کا سب سے پہلا فوری نتیجہ دس سالہ جنگ بندی تھا، جس نے چھ سال سے جاری کشمکش (بدر، احد، خندق و دوسری جھڑپوں) کے سلسلے کو روک دیا۔ جنگ بندی سے دونوں طرف کی جانیں محفوظ ہوئیں، مدینہ کے شہری سکون سے زندگی گزارنے لگے اور ریاست کی توانائیاں جنگی تیاریوں کے بجائے تنظیم، تعلیم و معیشت پر صرف ہونے لگیں۔ جنگ

بندی کے ماحول میں مدینہ کے داخلی استحکام میں بھی اضافہ ہوا، کیونکہ خارجی خطرے کا مسلسل دباؤ ختم ہوتے ہی قبائل و شہری جماعتوں کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانا ممکن ہوا۔ اس کے علاوہ صلح نے قریش کو مجبور کر دیا کہ وہ مدینہ کی ریاست کو ایک مساوی فریق کی حیثیت سے تسلیم کرے: معاہدہ کرنا خود ایک طرح کی حقیقی منظوری تھی کہ اب مدینہ ایک الگ سیاسی طاقت ہے جس سے معاملات تحریری معاہدوں سے طے ہوں گے۔ یہ تسلیم کاغذ پر چھوٹا نظر آتا ہے مگر سیاست میں اس کی حیثیت جنگ میں جیتنے کے برابر ہوتی ہے، کیونکہ جو ریاست دنیا کی نظر میں قائم ہو جائے اس کا خاتمہ پھر آسان نہیں رہتا۔ فوری نتائج میں یہ بھی شامل ہے کہ اگلے سال عمرۃ القضاء کی صورت میں مسلمان پورے وقار و نظم کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے، قربانی و عمرہ ادا کیا اور پورے عرب نے ان کے حسنِ اخلاق و نظم کو دیکھا، جس کا اخلاقی اثر کسی فتح سے کم نہ تھا۔

فوری نتائج (2): دعوت کے لیے آزاد فضا اور قبائل کی سمت

صلح کا دوسرا بڑا فوری نتیجہ دعوت و تبلیغ کے لیے کھلی فضا کا پیدا ہونا تھا۔ جنگ کے ماحول میں عام عرب قبائل کی توجہ عملی خبروں پر ہوتی تھی اور اسلام کا پیغام قریش کی تشہیر کے پردے میں دبا رہتا تھا۔ امن قائم ہوتے ہی لوگ مدینہ آنے جانے لگے، مکہ و مدینہ کے درمیان آمد و رفت شروع ہوئی اور مسلمان اپنے اخلاق و زندگی کے نمونے سے لوگوں کے دلوں پر اثر ڈالنے لگے۔ تاریخ کا معروف مشاہدہ ہے کہ صلح کے بعد کے قریب دو برسوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد اس سے پہلے کے انیس برس کی مجموعی تعداد کے برابر یا اس سے زیادہ ہو گئی، اور خالد بن ولید و عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما جیسی اہم شخصیات اسی دور میں اسلام لائے (عام سیرت ماخذ کا معروف بیان)۔ تیسرا فوری نتیجہ قبائل کی آزادانہ صف بندی تھا: معاہدے کی شق نے ہر قبیلے کو حق دیا کہ وہ مسلمانوں یا قریش میں سے جس کا حلیف بننا چاہے بن جائے۔ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف ہوئے اور بنو بکر قریش کے، اور اسی صف بندی نے بعد میں فتحِ مکہ کا قانونی و سیاسی پس منظر تیار کیا جب قریش نے اپنے حلیفوں کی مدد کر کے معاہدہ توڑا۔ یوں جو شق بظاہر غیر اہم تھی وہی آگے چل کر فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ان فوری نتائج سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ صلح کے معاہدوں میں وقتی دباؤ کے ساتھ دور بین شقیں رکھنا ہی اصل سیاسی دانش ہے۔

طویل المدتی نتائج(1): بیرونی سفارت کاری اور ریاست کی وسعت

طویل المدت میں صلح حدیبیہ نے مدنی ریاست کو حجاز کی مقامی طاقت سے نکال کر بین الاقوامی سیاست کا کھلاڑی بنا دیا۔ قریش کی طرف سے امن ملتے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آس پاس کی بڑی سلطنتوں و حکومتوں کو خطوط بھیجے، جن میں روم، فارس، مصر، حبشہ اور شام و یمن کے حکمران و سردار شامل تھے (سیرت ماخذ کے معروف خطوط کے مفہوم کا خلاصہ)۔ یہ اقدام اسی وقت ممکن تھا جب پشت محفوظ ہو؛ قریش کے ساتھ ملحوظ صلح حدیبیہ نے کیا تھا۔ اسی طرح یہودی طاقتوں و شمالی سرحد کی طرف توجہ کے لیے بھی امن کا یہ دور کام آیا اور خیبر سمیت شمالی معاملات نمٹائے گئے۔ طویل المدتی نتائج میں سب سے نمایاں اسلام کی عددی و جغرافیائی وسعت ہے: صلح کے وقت حدیبیہ میں مسلمانوں کی تعداد قریب چودہ سو تھی، جبکہ دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر لشکرِ اسلام دس ہزار تھا۔ یہ فرق تلوار سے نہیں بلکہ امن کے ماحول، اخلاقی نمونے اور کھلی دعوت سے پیدا ہوا، جس کا بنیادی کریڈٹ صلح کو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ مکہ کے وہ اہلِ صلاحیت لوگ جو صلح کے بعد اسلام لائے، آگے چل کر فتوحات و ریاست کے عظیم سپہ سالار و منتظم بنے، جس سے ریاست کی انسانی قوت کئی گنا بڑھ گئی۔

طویل المدتی نتائج(2): فتح مکہ اور عرب کا اتحاد

صلح کا سب سے بڑا طویل المدتی نتیجہ فتح مکہ کی راہ ہموار ہونا تھا۔ سن 8 ہجری میں بنو بکر نے قریش کی مدد سے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کیا، جس سے معاہدہ ٹوٹ گیا۔ اب اخلاقی و قانونی برتری مسلمانوں کے پاس تھی: بدعہدی انھوں نے نہیں قریش نے کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کے ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی کی اور شہر تقریباً بغیر خونریزی کے فتح ہو گیا، عام معافی کا اعلان ہوا اور خانہ کعبہ بتوں سے پاک کر دیا گیا۔ سیاسی تاریخ میں یہ کم ہی ہوتا ہے کہ دارالحکومتِ دشمن بغیر انتقام و قتلِ عام کے فتح ہو، اور اس کرم نوازی کی جڑ بھی حدیبیہ کی صلح پسند پالیسی تھی۔ فتح مکہ کے بعد پورے عرب کی سیاست کا مرکز مدینہ بن گیا، وفود کا سلسلہ شروع ہوا اور جزیرہ نما عرب تاریخی طور پر پہلی مرتبہ ایک ریاست کے تحت متحد ہونے لگا۔ اس اتحاد نے اگلی نسل میں دنیا کی بڑی سلطنتوں کے مقابل کھڑے ہونے کی بنیاد فراہم کی۔ یہ بھی دیرپا نتیجہ ہے کہ صلح

حدیبیہ نے مسلمانوں کی سیاست میں صبر، معاہدے کی پاس داری اور پرامن ذرائع کی عزت کو ہمیشہ کے لیے اصول بنا دیا: قرآن نے اس صلح کو فتح قرار دے کر یہ درس دیا کہ کامیابی ہمیشہ میدانِ جنگ کی جیت کا نام نہیں، بسا اوقات صبر سے حاصل ہونے والی صلح ہی سب سے بڑی فتح ہوتی ہے۔

جدول: صلح حدیبیہ کے نتائج کا خلاصہ

دور	نتیجہ	زمرہ
فوری	دس سالہ جنگ بندی، جانوں کا تحفظ	امن
فوری	قریش کی طرف سے مدنی ریاست کی حقیقی منظوری	اعتراف
فوری و جاری	امن میں اشاعت، کثیر تعداد میں قبولِ اسلام	دعوت
طویل المدتی	حکمرانوں کو خطوط، بین الاقوامی روابط	سفارت کاری
طویل المدتی	چودہ سو سے دس ہزار تک عددی ترقی	وسعت
طویل المدتی	فتحِ مکہ و وفود، عرب کا اتحاد	اتحاد

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے فوری نتائج میں جنگ بندی، انسانی جانوں کا تحفظ، مدنی ریاست کو قریش کی طرف سے حقیقی تسلیم، عمرۃ القضاء کی پرسکون ادائیگی اور دعوت کے لیے کھلی فضا شامل ہے، جبکہ طویل المدتی نتائج میں حکمرانوں تک سفارت کاری کی رسائی، اسلام کی تیز رفتار وسعت، اہلِ صلاحیت شخصیات کا دائرۂ اسلام میں آنا، فتحِ مکہ اور بالآخر جزیرہ نما عرب کا سیاسی اتحاد سرفہرست ہے۔ ان نتائج نے قرآن کے اس فیصلے کی عملی تفسیر کر دی کہ یہ صلح واقعی فتحِ مبین تھی۔ اس واقعے کا ابدی سبق یہ ہے کہ دور اندیش قیادت وقتی دباؤ کو قبول کر کے دیرپا مفاد حاصل کرتی ہے اور معاہدے کی شرائط کو اپنے اخلاق و نظم کی طاقت سے اپنے حق میں موڑ لیتی ہے۔

سوال نمبر 4: غزوہ بدر کے بنیادی اسباب اور مقاصد کا تجزیہ (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ غزوہ بدر کے بنیادی اسباب اور مقاصد کا تجزیہ کریں۔ (20)

تمہید و تعارف

غزوہ بدر کبریٰ 17 رمضان 2 ہجری کو پیش آیا اور یہ اسلام کی تاریخ کا پہلا بڑا معرکہ ہے جس کے نتائج نے جزیرہ نما عرب کی سیاست کا رخ ہمیشہ کے لیے موڑ دیا۔ اس غزوے میں مسلمانوں کی تعداد قریب تین سو تیرہ تھی جبکہ قریش کا لشکر تقریباً ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا، سامانِ جنگ میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا، اس کے باوجود فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی (عام سیرت ماخذ کے معروف اعداد و واقعات)۔ اس غزوے کو درست طور پر سمجھنے کے لیے صرف میدانِ جنگ کی تفصیلات کافی نہیں، بلکہ اس کے اسباب و مقاصد کا تجزیہ ضروری ہے، کیونکہ بعض سطحی بیانات میں اسے محض ایک تجارتی قافلے سے ٹکراؤ سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا پس منظر تیرہ سالہ مکی ظلم و ستم، ہجرت کے بعد کی مسلسل کشمکش اور نئی ریاست کے وجود و بقا کا سوال تھا۔ تجزیے کا منصفانہ طریقہ یہ ہے کہ واقعات کو ان کی زمانی ترتیب میں رکھ کر دیکھا جائے: پہلے وہ اسباب بیان ہوں جنھوں نے تصادم کو ناگزیر بنایا، پھر مسلمانوں کے مقاصد واضح کیے جائیں، جن میں دفاعی، معاشی و سیاسی پہلو شامل ہیں، اور آخر میں اسباب و مقاصد کے باہمی تعلق کا جائزہ لیا جائے۔ یہ بحث خالصتاً تاریخی و علمی ہے؛ واقعات کے خلاصے معروف سیرت ماخذ کے مفہوم کی صورت میں دیے گئے ہیں۔

سبب 1 تا 2: مکی ظلم و ستم اور مسلسل عداوت

غزوۂ بدر کا پہلا بنیادی سبب قریش کا وہ تیرہ سالہ ظلم تھا جو مکہ میں مسلمانوں پر ڈھایا گیا۔ اس دور میں مسلمانوں کو سماجی بائیکاٹ، معاشی ناکہ بندی، جسمانی اذیت، جائیدادوں کی ضبطی اور بعض اوقات جان سے مارنے تک کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر پہلے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ہجرت کے بعد بھی قریش کی عداوت جاری رہی: انھوں نے مدینہ کے یہودی قبائل اور منافقین کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا، عبداللہ بن ابی کو دھمکی آمیز خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکالو ورنہ ہم خود آ کر کارروائی کریں گے، اور مکہ میں بچ جانے والے کمزور مسلمانوں پر دباؤ جاری رکھا۔ ایسے ماحول میں مدنی ریاست کے لیے خاموشی کا مطلب اپنے وجود کو مسلسل خطرے میں رکھنا

تھا۔ دوسرا سبب قریش کی وہ عسکری تیاریاں اور جھڑپیں تھیں جو ہجرت کے بعد کے انیس ماہ میں پیش آئیں: کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کر کے مویشی لوٹے، اور چھوٹے چھوٹے سریے و گشتی دستے دونوں طرف سے گردش کرتے رہے، جس سے واضح تھا کہ بڑا تصادم محض وقت کا سوال ہے۔ ان اسباب سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کسی اچانک جوش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک لمبے تاریخی سلسلے کی کڑی تھی جس میں مظلوم فریق آخرکار اپنے دفاع کے لیے میدان میں کھڑا ہوا۔

سبب 3 تا 4: تجارتی قافلہ اور مہاجرین کا ضبط شدہ مال

تیسرا سبب وہ معاشی پس منظر ہے جو قریش کے تجارتی قافلوں سے جڑا تھا۔ قریش کی معیشت شام و یمن کی تجارت پر کھڑی تھی اور ان کے قافلے مدینہ کے قریب سے گزرتے تھے۔ ان قافلوں کی سرمایہ کاری میں بڑا حصہ اس مال کا بھی تھا جو مکہ میں مہاجرین کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں کو بیچ کر یا ان کے اموال پر قبضہ کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق بدر کے موقع پر ابوسفیان کی سربراہی میں آنے والا بڑا قافلہ اسی سلسلے کی اہم کڑی تھا جس میں مکہ کے تقریباً ہر گھرانے کی سرمایہ کاری شامل تھی۔ مسلمانوں کا اس قافلے کی طرف نکلنا اسی ضبط شدہ حق کی واپسی اور دشمن کی معاشی شہ رگ پر دباؤ کی کوشش تھا، جو اس دور کے جنگی اصولوں میں ایک جانی پہچانی حکمتِ عملی تھی۔ چوتھا سبب یہ خبر تھی کہ ابوسفیان نے قریش کو امداد کے لیے پکارا ہے اور مکہ سے ایک ہزار کا لشکر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکل پڑا ہے۔ جب قریش کا لشکر بدر تک پہنچ گیا اور جنگ سے پیچھے ہٹنا ان کی ساکھ کے خلاف تھا، تو معرکہ روبرو ہو گیا۔ ان اسباب کا خلاصہ یہ ہے کہ قافلہ سببِ قریب تھا جبکہ ظلم، عداوت اور ضبط شدہ اموال سببِ بعید تھے، اور دونوں کے ملنے سے وہ صورتحال بنی جس نے غزوۂ بدر کو ناگزیر کر دیا۔

مقصد 1 تا 2: دفاع و بقا اور مظلومیت کا عملی جواب

مقاصد کے تجزیے سے سب سے پہلے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا بنیادی مقصد جارحیت نہیں بلکہ دفاع و بقا تھا۔ قرآن کریم میں اس دور کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا انھیں لڑنے کی اجازت دی گئی کیونکہ ان پر ظلم ہوا تھا (سورۃ الحج 22:39 تا 40 کے مفہوم کا خلاصہ)۔ مدنی ریاست ابھی نوزائیدہ تھی: اگر اس مرحلے پر قریش اسے دھمکیوں اور لوٹ مار سے ختم کر دیتے تو ہجرت کی پوری کوشش ضائع ہو جاتی اور عرب میں یہ اعلان ہو جاتا کہ مسلمانوں کے لیے کوئی محفوظ

مقام نہیں۔ لہٰذا پہلا مقصد ریاست اور کمیونٹی کے وجود کی حفاظت تھا۔ دوسرا مقصد مظلومیت کا عملی جواب اور حق واپسی تھا۔ تیرہ سال تک مسلمانوں نے مکہ میں صبر کیا اور تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دیا؛ ہجرت کے بعد جب انھیں ایک منظم ریاست نصیب ہوئی تو اپنے چھینے گئے مال و حقوق کی بازیابی ایک فطری و قانونی مقصد بن گئی، جس کی طرف قافلے کی مہم اشارہ کرتی ہے۔ ان دو مقاصد سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بدر کی مہم کو توسیع پسندی یا لوٹ مار سے تعبیر کرنا تاریخی انصاف نہیں، کیونکہ توسیع پسند فریق وہ تھا جس نے پہلے لوگوں کو عقیدے کی بنا پر گھروں سے نکالا اور پھر ان کی جائدادیں فروخت کر کے قافلے سجائے۔ منصفانہ تجزیہ ہمیشہ یہی دیکھتا ہے کہ جنگ کا آغاز کرنے والا کون اور اسباب پیدا کرنے والا کون تھا۔

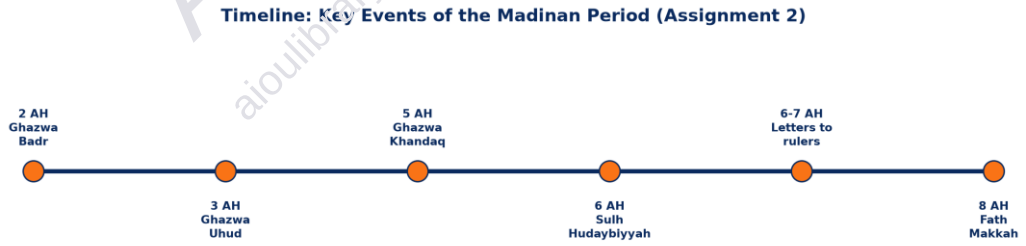
مقصد 3 تا 4: قریش کی عسکری ساکھ کا خاتمہ اور ریاست کا استحکام

تیسرا مقصد قریش کی عسکری و سیاسی ساکھ کو وہ ضرب لگانا تھا جس سے مدینہ کے خلاف مستقبل کی جارحیت کی قیمت بڑھ جائے۔ قریش پورے عرب میں ناقابلِ شکست سمجھے جاتے تھے؛ ان کی تجارتی بالادستی کی پشت پر یہی عسکری رعب تھا۔ بدر میں ان کے ستر بڑے سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے (عام سیرت ماخذ کے معروف اعداد)، ابوجہل جیسا دشمنِ اول ختم ہوا اور قریش کا غرور ٹوٹ گیا، جس کا نفسیاتی اثر پورے عرب پر پڑا۔ چوتھا مقصد مدنی ریاست کا داخلی استحکام تھا۔ فتح نے مہاجرین و انصار کے حوصلے بلند کیے، منافقین و یہودی قبائل کو پیغام ملا کہ یہ ریاست کمزور نہیں اور گردوپیش کے قبائل نے مسلمانوں سے معاہدات و تعلقات کی سمت اپنانی شروع کی۔ اس کے علاوہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور فدیے میں پڑھے لکھے قیدیوں سے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھوانے جیسی مثالیں مفتوح فریق کے انسانی مقاصد کو بھی روشن کرتی ہیں کہ جنگ آخر نہ تھی، اصل مقصد عدل و امن کا نظام تھا۔ یہاں یہ نکتہ بھی تجزیے کا حصہ ہے کہ بدر کے بعد مسلمانوں کا مقصد انتقام نہیں رہا بلکہ فتحِ مکہ کے عام معافی کے اعلان نے ثابت کیا کہ اصل ہدف ظلم کا نظام ختم کرنا تھا، انسانوں کا خاتمہ نہیں۔ اس لحاظ سے اسباب و مقاصد کا یہ مجموعہ ایک دفاعی و اصلاحی جنگ کی تصویر پیش کرتا ہے، جسے اسلامی تاریخ میں یوم الفرقان یعنی حق و باطل کے فیصلے کا دن کہا گیا (سورۃ الانفال 8:41 کے مفہوم کی طرف اشارہ)۔

جدول: غزوہ بدر — اسباب و مقاصد کا تجزیاتی خلاصہ

وضاحت	نکتہ	زمرہ
تیرہ سال کی اذیت، جائیدادوں کی ضبطی	مکی ظلم و ہجرت پر مجبوری	سببِ بعید
یہود و منافقین کو اکسانا، چراگاہ پر حملہ	ہجرت کے بعد عداوت و دھمکیاں	سببِ بعید
ضبط شدہ مال سے چلتی تجارت، لشکر کی آمد	ابوسفیان کا قافلہ و قریش کا لشکر	سببِ قریب
نوزائیدہ مدنی ریاست کی حفاظت	دفاع و بقائے ریاست	مقصد
مستقبل کی جارحیت کی قیمت بڑھانا	قریش کی ساکھ کا خاتمہ	مقصد
مظلوم فریق کا قانونی و اخلاقی موقف	حقوق کی بازیابی	مقصد

AIOU LIBRARY aioulibrary.com



شکل: مدنی دور کے نمایاں واقعات میں غزوۂ بدر (2ھ) کا مقام۔

نتیجہ

تجزیے کا خلاصہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے اسباب میں مکی ظلم و ستم، ہجرت کے بعد مسلسل عداوت و دھمکیاں، مہاجرین کے ضبط شدہ اموال سے چلنے والی تجارت اور آخر میں ابو سفیان کے قافلے و قریش کے لشکر کی آمد شامل تھی، جبکہ مقاصد میں نوزائیدہ ریاست کا دفاع، مظلوموں کے حقوق کی بازیابی، قریش کی جارحانہ ساکھ کا خاتمہ اور مدینہ کا داخلی استحکام سرفہرست تھے۔ ان اسباب و مقاصد کو ان کے تاریخی تسلسل میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر جارحیت نہیں، دفاع تھا، اور اس کی فتح نے اس اصول کو ثابت کیا کہ

تاریخی معرکوں کا فیصلہ صرف تعداد و اسلحہ سے نہیں ہوتا بلکہ حق پر ہونے کے شعور، نظم و ضبط اور قیادت کی حکمت سے بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر اسلامی تاریخ میں محض ایک جنگ نہیں بلکہ ایک مستقل سیاسی و اخلاقی موڑ سمجھا جاتا ہے۔

سوال نمبر 5: عہدِ نبوی میں سفارت کاری کے اصول اور آج ان پر عمل کی صورتیں — مضمون (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ عہدِ نبوی میں سفارت کاری کے اصول کیا تھے اور ان پر آج کیسے عمل کیا جا سکتا ہے؟ مضمون لکھیں۔ (20)

تمہید و تعارف

سفارت کاری ریاستوں کے درمیان تعلقات کا وہ فن ہے جس کے ذریعے جنگ کے بجائے مذاکرات، معاہدوں اور نمائندوں کے تبادلے سے مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر جدید سفارت کاری کو یورپ کی حالیہ صدیوں کی پیداوار سمجھا جاتا ہے، لیکن مدنی ریاست کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ علیہ السلام نے چودہ سو سال پہلے سفارت کاری کے وہ اصول عملاً قائم کر دیے تھے جن میں سفیر کی عزت و تحفظ، تحریری خطوط و معاہدے، مذاکرات میں حکمت و صبر اور وعدے کی مکمل پاس داری شامل ہیں۔ مدینہ کی نوزائیدہ ریاست نے سفارت کاری ہی کے ذریعے آس پاس کے قبائل سے درجنوں معاہدے کیے، قیصر و کسریٰ سمیت بڑی سلطنتوں کے حکمرانوں کو خطوط بھیجے، نجران و دیگر علاقوں کے وفود کا استقبال کیا اور صلح حدیبیہ جیسا تاریخی معاہدہ کر کے دکھایا کہ امن بھی طاقت کا دوسرا نام ہو سکتا ہے۔ اس مضمون کا مقصد دوہرا ہے: پہلے عہدِ نبوی کی سفارت کاری کے اصول واقعات کی روشنی میں بیان کرنا، اور پھر یہ تلاش کرنا کہ آج کے دور میں مسلمان ریاستوں کی خارجہ پالیسی اور عام بین الاقوامی تعلقات میں ان اصولوں پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ مضمون میں اصول و واقعات عام سیرت ماخذ کے معروف مفاہیم کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں اور معاصر تجاویز تجزیاتی نوعیت کی ہیں۔

اصول 1 تا 2: سفیر کا تحفظ و عزت اور پیغام کی وضاحت

عہدِ نبوی کی سفارت کاری کا پہلا اصول سفیر کا مکمل تحفظ و احترام تھا۔ اسلامی تعلیم و عمل کے مطابق سفیر کو قتل نہیں کیا جاتا، اس کی بات سنی جاتی ہے اور اسے امان کے ساتھ واپس بھیجا جاتا ہے، خواہ وہ دشمن ریاست ہی کا نمائندہ کیوں نہ ہو۔ اس اصول کی اہمیت اس وقت کھلتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ دورِ جاہلیت میں بھی سفیر کی حرمت ایک مسلمہ روایت تھی جسے اسلام نے برقرار رکھا اور قانون کی حیثیت دی۔ دوسری طرف اسلام دشمن کے سفیر کے قتل کو سخت جرم قرار دیتا رہا اور مسلمان ریاستوں کی تاریخ میں اس اصول کی پاس داری عام طور پر قائم رہی۔ اسی اصول کی روشنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کذاب مسیلمہ کے سفیر آئے تو ان کی گستاخانہ باتوں کے باوجود انھیں صرف اس لیے کچھ نہ کہا گیا کہ سفیر قتل نہیں کیے جاتے (عام سیرت ماخذ کے معروف واقعے کے مفہوم کا خلاصہ)۔ دوسرا اصول پیغام کی وضاحت و صداقت تھا۔ آپ کے خطوط مختصر، واضح اور شائستہ ہوتے تھے جن میں بھیجنے والے کا نام، مخاطب کا نام پورے احترام کے ساتھ، اور دعوت کا مقصد صاف بیان ہوتا تھا۔ سفیر منتخب کرتے وقت اس کی ذہانت، دیانت، زبان دانی اور اعتماد کو دیکھا جاتا تھا؛ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کا قیصر کے پاس جانا اور حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا کسریٰ کے دربار میں خط پہنچانا اسی انتخاب کی مثالیں ہیں۔ واضح پیغام غلط فہمیوں کو ختم کرتا ہے اور مذاکرات کو نتیجہ خیز بناتا ہے، جبکہ مبہم و دوغلی سفارت کاری ہمیشہ بداعتمادی پیدا کرتی ہے۔

اصول 3 تا 4: معاہدے کی پاس داری اور مذاکرات میں حکمت و صبر

تیسرا اصول معاہدے کی پاس داری تھا، جو نبوی سفارت کاری کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ قرآن کریم نے معاہدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور بدعہدی کو سخت ناپسند کیا ہے (سورۃ النحل 16:91 اور سورۃ التوبہ 9:4 کے مفاہیم کا خلاصہ)۔ عملی زندگی میں یہی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے معاہدے ان حالات میں بھی نبھائے جب وہ وقتی طور پر ان کے خلاف جاتے تھے: صلح حدیبیہ کے بعد ابو جندل رضی اللہ عنہ کے معاملے میں معاہدے کی شق پر عمل کیا گیا حالانکہ وہ منظر صحابہ کے لیے سخت تھا، اور یہی پاس داری آگے چل کر مسلمانوں کی سفارتی ساکھ کی بنیاد بنی کہ جس ریاست سے وہ وعدہ کریں اس پر پورا اترتے ہیں۔ چوتھا اصول مذاکرات میں حکمت، صبر اور لچک تھا۔ حدیبیہ کے مذاکرات میں بار بار کے مراحل، نمائندوں کی آمد و رفت اور بعض شرائط پر نرمی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے: عرف عام کی شرائط میں سے وہ باتیں قبول کر لی گئیں جن سے اصل مقصد، یعنی امن و

ریاست کا اعتراف، حاصل ہو رہا تھا۔ اس کے برخلاف جس بات پر اصولی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا وہاں ثبات اختیار کیا گیا۔ یہ حکمت سکھاتی ہے کہ سفارت کار کو معلوم ہونا چاہیے کہ کون سی بات رعایتی ہے اور کون سی اصولی، تاکہ وہ وقتی علامتی چیزوں پر دور رس فائدے قربان نہ کرے اور اصولی بات پر وقتی فائدے کی خاطر سمجھوتہ نہ کرے۔

اصول 5 تا 6: وفود کا نظام اور پرامن بقائے باہمی

پانچواں اصول وفود کے استقبال و اکرام کا نظام تھا۔ مدنی دور میں عرب کے کونے کونے سے قبائل و علاقوں کے وفود مدینہ آئے، جن میں ثقیف (طائف)، نجران کے عیسائی، عبدالقیس، تمیم اور یمن کے وفود خاص طور پر معروف ہیں۔ ان وفود کو مسجدِ نبوی و مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا، ان کی بات غور سے سنی جاتی، ان کے سوالات کے جواب دیے جاتے اور انھیں تحائف و احترام کے ساتھ رخصت کیا جاتا تھا۔ نجران کے عیسائی وفد کو مسجد میں اپنی عبادت کی اجازت دینے جیسا رویہ مذہبی رواداری و سفارتی شائستگی کی غیر معمولی مثال ہے (سیرت ماخذ کے معروف واقعے کا خلاصہ)۔ چھٹا اصول پرامن بقائے باہمی کو اولین ترجیح دینا تھا۔ مدنی سفارت کاری میں جہاں بھی پرامن راستہ ممکن ہوا اسے اختیار کیا گیا: قبائل سے عدم جارحیت و دفاعی معاہدے، یہودی قبائل کے ساتھ میثاق، اور حلیفوں کے ساتھ غیر مشروط وفاداری نے ریاست کو ایسا امن پسند چہرہ دیا جس کی وجہ سے وفود خود چل کر مدینہ آنے لگے۔ جنگ اس نظام میں آخری راستہ تھی، پہلا نہیں، اور جب ناگزیر بھی ہوئی تو اس میں بھی اخلاقی ضوابط قائم رکھے گئے۔ ان دونوں اصولوں نے مل کر ریاست کی نرم طاقت یعنی اخلاق، رواداری و ساکھ کو وہ مقام دیا جس کی وجہ سے سفارت کاری صرف خطوط و سفیر کا نام نہ رہی بلکہ پورا تمدنی نمونہ بن گئی۔

جدول: عہدِ نبوی کی سفارت کاری کے اصول اور آج کی تطبیق

اصول	نبوی عملی مثال	آج کی عملی صورت
سفیر کا تحفظ	مسیلمہ کے سفیروں کو امان	سفارت کاروں کے قانونی تحفظ کے عالمی اصولوں کی پابندی
واضح و سچا پیغام	حکمرانوں کو صریح خطوط	شفاف خارجہ بیانات، دوغلی پالیسی سے اجتناب

بین الاقوامی معاہدوں کا احترام، بدعہدی سے پرہیز	حدیبیہ کی شقوں پر عمل	معاہدے کی پاس داری
تنازعات کا پرامن حل، ماہر مذاکرات کار	حدیبیہ میں لچک و ثبات کا توازن	مذاکرات میں حکمت
ثقافتی سفارت کاری، بین المذاہب مکالمہ	نجران و قبائل کے وفود کا اکرام	وفود و تعلقات عامہ
علاقائی امن اتحاد، عدم جارحیت معاہدے	میثاق و حلف کا نظام	پرامن بقائے باہمی

آج ان اصولوں پر عمل کی صورتیں

آج کے دور میں ان اصولوں پر عمل کئی صورتوں میں ممکن ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان ریاستوں کی خارجہ پالیسی میں معاہدے کی پاس داری کو قومی ساکھ کی بنیاد بنایا جائے: جو معاہدے کیے جائیں انھیں حکومتوں کی تبدیلی کے باوجود نبھایا جائے، کیونکہ عالمی نظام میں اعتماد ہی اصل سرمایہ ہے، اور نبوی اصول بھی یہی ہے۔ دوسری صورت سفارت کاروں کی تربیت و انتخاب ہے: سفیر محض اہل کار نہیں بلکہ ملک و ملت کا اخلاقی نمائندہ ہو، اسے میزبان ملک کی زبان و ثقافت معلوم ہو، اس کا بیان سچا و واضح ہو اور وہ ذاتی مفاد سے پاک ہو۔ تیسری صورت تنازعات کے پرامن حل کو ترجیح دینا ہے: پڑوسی ممالک سے مسائل پر مذاکرات کی میز کو ہمیشہ کھلا رکھنا، ثالثی و بین الاقوامی قانون کا سہارا لینا اور جنگی بیان بازی سے گریز کرنا اسی نبوی حکمت کی جدید شکل ہے۔ چوتھی صورت ثقافتی و عوامی سفارت کاری ہے: تعلیمی تبادلے، علمی و مذہبی وفود، امدادی کام اور میڈیا پر اپنی تہذیب کے پرامن نمونے کی پیش کش سے وہی کام لیا جا سکتا ہے جو مدنی دور میں وفود کے اکرام سے لیا گیا تھا۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ اقلیتوں و دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کے عملی رویے سے ملک کی عالمی ساکھ بنائی جائے۔ البتہ کسی شرعی مسئلے کے قطعی اطلاق اور قومی پالیسی کے شرعی فیصلوں میں علماء و مجاز اداروں کی رہنمائی لازم رہتی ہے؛ یہ مضمون صرف اصولوں کی علمی و تجزیاتی وضاحت پیش کرتا ہے۔

نتیجہ

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی کی سفارت کاری چھ بڑے اصولوں پر قائم تھی: سفیر کا تحفظ و احترام، پیغام کی وضاحت و صداقت، معاہدے کی مکمل پاس داری، مذاکرات میں حکمت و لچک اور اصولی ثبات کا توازن، وفود کے اکرام و تعلقاتِ عامہ کا نظام، اور پرامن بقائے باہمی کو اولین ترجیح۔ ان اصولوں نے مدنی ریاست کو جنگ کے بغیر وہ مقام دلایا جو بڑی بڑی فوجیں بھی نہیں دلا سکتیں، اور حدیبیہ سے فتحِ مکہ تک کا سفر اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ آج کی دنیا میں جب جنگوں کی قیمت بڑھ چکی ہے اور ساکھ و اعتماد ہی اصل طاقت ہے، ان اصولوں پر عمل کرنا مسلمان ریاستوں کے لیے محض دینی فخر نہیں بلکہ عملی ضرورت ہے۔ جو سفارت کاری سچ، وعدے کی پاس داری اور حکمت پر کھڑی ہو وہ عارضی فائدوں کے بجائے دیرپا عزت کماتی ہے، اور یہی عہدِ نبوی کا ابدی سبق ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com